شمائلہ شاد

ماہ نامہ ساقی کے اداریے اور شاہد احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۲ء) کی نثر میں بیان کی سادگی، لہجے کا اُتار چڑھاؤ، کم لفظوں میں بات کہنے کا سلیقہ، عام بول چال کی بامحاورہ اور ٹکسالی زبان ان کے منفرد اسلوب کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ انداز ان کے پوتے شاہد احمد دہلوی کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی ادبیت کے بارے میں ملّا واحدی میرے زمانے کی دلی میں لکھتے ہیں:

مسٹر شاہد احمد ادیب ابنِ ادیب ابنِ ادیب ہیں۔[۱]

میاں بشیر الدین احمد (۱۸۶۱ء۔۱۹۲۷ء) نذیر احمد دہلوی کے بڑے بیٹے تھے۔ شاہد احمد دہلوی، میاں بشیر الدین احمد کی تیسری اولاد تھے اور ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔[۲] ابتدائی تعلیم رائے پور کے کانونٹ اسکول میں حاصل کی لیکن جب ان کے خاندان نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی تو وہاں پر تعلیمی سلسلے کا آغاز ایم اے او اسکول سے کیا اور بعد میں عربک اسکول سے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔[۳] میٹرک کے امتحان سے تین ماہ قبل ۱۹۲۲ء میں ان کی پہلی شادی ہوئی۔ اس کا اثر ان کے تعلیمی نتائج پر پڑا اور میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوگئے۔ دوبارہ میٹرک کا امتحان انھوں نے مشن اسکول سے ۱۹۲۳ء میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔[۴] ۱۹۲۵ء میں فورمین کرسچین کالج، لاہور سے ایف ایس سی (پری میڈیکل) کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور میڈیکل کالج میں داخلہ لیا لیکن اہلیہ کی شدید علالت اور والد کی بیماری کی وجہ سے جلد ہی میڈیکل کی پڑھائی سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا اور طبّ کی تعلیم کے حصول کا ارادہ ترک کر کے واپس دہلی چلے گئے اور وہاں پر انگریزی ادبیات میں بی اے (آنرز) کیا۔[۵]

بی اے کے بعد انھوں نے ۱۹۲۹ء میں (دلّی) مشن کالج میں ایم اے فارسی کے دو پرچے بھی دیے لیکن کچھ ہی عرصے بعد شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن سے عربی پڑھنے میں کچھ ناراضگی ہوگئی تو انھوں نے کالج

چھوڑ دیا اور ایم اے مکمل نہ کر سکے۔(۶)

تعلیمی سرگرمیوں کے ختم ہوتے ہی ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا جو ان کے ادبی رسالے ماہ نامہ ساقی کے اجرا کی صورت میں تھا۔ انھوں نے ساقی کو اپنے ادبی ذوق اور دوستوں کی مشاورت و تعاون سے یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو دہلی سے جاری کیا۔(۷)

شاہد احمد دہلوی کا اسلوب

ساقی کا مکمل فائل دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروری ۱۹۲۵ء سے مئی ۱۹۶۷ء تک شاہد احمد دہلوی مسلسل لکھتے رہے۔ مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والا ساقی کا شمارہ ان کی زندگی کا آخری شمارہ ثابت ہوا۔(۸) اس میں بھی ان کا اداریہ موجود ہے۔(۹) بیالیس برس کے اس ادبی سفر میں اگر ان کے اسلوب اور طرزِ تحریر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ابتدائی چند تحریروں کے علاوہ شروع میں ان کا اسلوب سلاست اور عبارات آرائی کا مِلا جُلا رنگ پیش کرتا ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس میں روانی، شگفتگی اور خیال و بیان کی ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں شاہد احمد دہلوی کی نثر اپنی ایک الگ پہچان بناتی ہے۔ اس دور کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوتا ہے جو کہ ان کے مجلّے کی ادارت سے شروع ہوتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی بات کہنے کا ہنر شاہد احمد دہلوی کے اسلوب کو ایک منفرد مقام دلاتا ہے۔ اُردو کے معروف نقّاد ڈاکٹر شوکت سبزواری ان کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاہد احمد فکر و خیال کے منطقی اصولوں کے مطابق چھوٹے اور مختصر سادہ جملوں کا استعمال اس خوب صورتی سے کرتے ہیں کہ خیال و بیان کی ہم آہنگی بھی متاثر نہیں ہوتی اور بات بھی مختصر پیرائے میں بیان ہو جاتی ہے۔(۱۰)

شاہد احمد دہلوی کی نثر کی اس خوب صورتی کو جمیل جالبی نے ''دلّی اسکول'' کی نمائندہ نثر قرار دیا ہے۔(۱۱) کیوں کہ ان کی نثر میں نہ صرف دلّی کی ٹکسالی زبان وجہِ شگفتگی بنتی ہے بلکہ ان کی نثر میں دلّی اسکول کے نمائندہ صاحبِ طرز ادیبوں (ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد) کے اسلوب کی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کی نثر میں ضرب الامثال محاورے، استعارے، دلّی کی ٹھیٹھ زبان، مخصوص الفاظ و محاورات اور روزمرہ کا صحیح استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ بقول جمیل جالبی، شاہد احمد دہلوی کی نثر میں شگفتگی اور واقعات کا بیان ایسا ہے جیسے کوئی موتیوں کو دل کے تار میں پِروتا جاتا ہے۔ انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے فارسی اور عربی الفاظ کے بے دریغ استعمال سے بھی نثر کی شان و شوکت نہیں بڑھاتے بلکہ اپنے خاندانی وصف کے مطابق زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو

برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔[۹]

ان کی نثر کا ایک عمدہ نمونہ ان کی خاکوں کی کتاب گنجینۂ گوہر ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے اسلوب میں ایک خاص بات جو ان کی پوری نثر پر چھائی ہوئی ہے وہ دلّی سے محبت، اس کی زبان و بیان سے عقیدت ہے اور یہی عقیدت اور محبت ان کی نثری تصانیف میں ہر جگہ جھلکتی ہے۔ اس محبت اور زبان کی شستگی کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> شاہد مرحوم دلّی مرحوم کے روڑے تھے۔ ان کی زبان دلّی کی شستہ، شگفتہ، نتھری اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان ہے جس کی آن بان، لطف و لطائف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجال ہے کہ کوئی پڑھے اور چٹخارے نہ لے۔ میٹھے میٹھے گھونٹ ہیں کہ حلق سے اُترتے چلے جاتے ہیں۔ مرحوم زبان کے پارکھ اور حسنِ بیاں کے رسیا تھے۔[۱۰]

رسالہ ساقی کا اجرا

بیسویں صدی میں اُردو زبان و بیان کی ترقی و ترویج میں اخبارات کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے کیوں کہ اس دور کے ادبی رسائل پر نظر ڈالی جائے تو اسی عہد میں ''انجمن ترقیٔ اُردو'' کا ترجمان رسالہ اُردو ۱۹۲۱ء میں مولوی عبدالحق نے نکالا۔ اس کے تقریباً ایک سال بعد آگرہ سے نیاز فتح پوری کی زیرِ ادارت فروری ۱۹۲۲ء میں ادبی رسالہ نگار شائع ہوا جو جنوری ۱۹۲۲ء سے جون ۱۹۲۷ء تک بھوپال اور اس کے بعد جولائی ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک لکھنؤ سے نکلتا رہا اور اس کے بعد بلا تاخیر یہ کراچی سے اگست ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا۔[۱۴] انھی دنوں لاہور سے ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ادبی دُنیا شائع ہو رہے تھے۔ دہلی کی ادبی سرگرمیوں میں کسی بڑے ادبی رسالے کی اشاعت میں کمی کو محسوس کرتے ہوئے زبان کی ترقی اور قدردانی کے لیے شاہد احمد دہلوی نے جنوری ۱۹۳۰ء میں ماہ نامہ ساقی کا اجرا کیا۔

جنوری ۱۹۳۰ء سے لے کر فروری ۱۹۴۳ء تک ماہ نامہ ساقی مسلسل شائع ہوتا رہا۔ ابتدا ہی سے اس میں مضامین لکھنے والے مصنّفین کی فہرست میں بڑے بڑے نام شامل رہے[۱۵] جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم میں کاغذ کی کم یابی کے سبب مارچ ۱۹۴۳ء سے نومبر ۱۹۴۳ء تک اشاعت کا سلسلہ بند رہا۔[۱۶] ساقی کی دوبارہ اشاعت پورے نو مہینے بعد دسمبر ۱۹۴۳ء میں

ہوئی اور اگست ۱۹۴۷ء تک یہ مسلسل چھپتا رہا۔[۱۷]

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد ہنگاموں اور نقل مکانی کی وجہ سے پورا ایک سال ساقی شائع نہ ہوسکا۔ شاہد احمد دہلوی کے مستقل طور پر پاکستان (کراچی) میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں ساقی کا پہلا شمارہ ان کی ادارت میں شائع ہوا[۱۸] اور مسلسل ان کی ادارت میں مئی ۱۹۶۷ء یعنی ان کی وفات تک چھپتا رہا۔ شاہد احمد کی وفات کے بعد ساقی ان کی اہلیہ عاصمہ شاہد کی کوششوں اور خصوصاً ڈاکٹر جمیل جالبی کے تعاون سے ۱۹۷۰ء تک نکلتا رہا۔[۱۹] اس عرصے میں ساقی کا معیار وہ تو نہ رہا جو شاہد احمد دہلوی کی زندگی میں تھا لیکن پھر بھی کافی حد تک اس کے مضامین اہمیت کے حامل رہے۔ سب سے اہم ''نمبر'' اس عرصے کا شاہد احمد دہلوی نمبر ہے جو جالبی صاحب کی محنت، محبت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہی ساقی کا آخری شمارہ تھا۔ اس کے بعد ساقی حتمی طور پر بند ہوگیا۔

ماہ نامہ ساقی کے سرِورق (ٹائٹل) پر شاہد احمد دہلوی اور ساقی کی مناسبت سے اقبالؔ کا یہ شعر درج ہوتا رہا:

اس دور میں مے اور ہے ، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و ''کرم'' اور

شعر میں ''ستم'' کی جگہ لفظ ''کرم'' لکھا جاتا تھا۔

ساقی کی اس پوری زندگی میں مختلف موضوعات، شخصیات اور واقعات کی مناسبت سے اہم اور خاص نمبر کی اشاعت کا رواج بھی قائم رہا۔ اور سال نامے کے ساتھ ساتھ افسانہ نمبر، ظریفانہ نمبر اور دلّی نمبر اس کی پہچان رہے۔

ساقی کے خاص نمبروں میں موضوع کے حوالے سے ایسے اہم مضامین شامل ہیں جو اُردو ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آزادی کے بعد کے خاص نمبروں میں ساقی کا مشرقی پاکستان نمبر، جوش نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء)، جنگ نمبر (جنوری، فروری ۱۹۶۶ء) اور جنگ کے ایک سال بعد اُسی مہینے میں دوسرا یادگار جنگ نمبر (ستمبر ۱۹۶۶ء) قیمتی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۰ء سے دوسری جنگ عظیم کے آغاز ۱۹۳۹ء تک

شاہد احمد دہلوی کی زیرادارت شائع ہونے والا مجلّہ ساقی اس لیے بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے شاہد احمد کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ آغاز ساقی کے اداریے نگاہِ اوّلیں سے ہوتا

ہے جس میں انھوں نے نہ صرف ساقی میں شائع ہونے والے مضامین کے بارے میں مختصراً تحریر کیا ہے بلکہ ایک نقّاد کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے ان مضامین پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

نگاہِ اوّلیں کے نام سے لکھے جانے والے اداریوں کے مطالعے سے نہ صرف شاہداحمد کے ادبی رُجحانات کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ ان میں ادب اور ادبی مباحث کے ساتھ ساتھ اس عہد میں رُونما ہونے والے اہم واقعات پر بھی شاہداحمد دہلوی کا تجزیہ ملتا ہے۔ چاہے وہ ادیبوں کے ساتھ ہونے والے معرکے ہوں یا اُردوزبان کی ترقی و ترویج کا مسئلہ ہو، یا اہم شخصیات کا سفرِ عدم۔ شاہداحمد دہلوی نے سب موضوعات کو وقت کی مناسبت اور حالات کے مطابق اپنے اداریے کی زینت بنایا۔

ساقی کے اداریوں میں شاہداحمد دہلوی کا اسلوب

شاہداحمد دہلوی کا اسلوب ان کے اداریوں میں ان کی دیگر ادبی تحریروں سے قدرے مختلف ہے۔ اگر ہم ۱۹۳۰ء کے اداریوں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں وہ طرز زیادہ نظر نہیں آتا جو گنجینۂ گوہر میں ایک عمدہ خاکہ نگار کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے اداریوں کا اپنا ایک الگ انداز ہے جو انھیں اس وقت بھی دوسروں سے ممتاز ظاہر کرتا ہے۔

ابتدائی اداریوں میں ان کی تحریر میں ہمیں کہیں سلاست اور کہیں عبارت آرائی کا مِلا جُلا انداز ملتا ہے مثلاً جنوری ۱۹۳۰ء کے اداریے کی یہ عبارت:

> جو حلاوت اور غذوبیت اور شیرینی اُردوزبان میں ہے کسی زبان میں موجود نہیں۔ یہ وہ پودا ہے جس کو بادشاہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ اُمرا نے اس کی نشوونما کی اور ہندوستان کے مایہ ناز اہلِ قلم نے اپنے رشحاتِ قلم سے اس کی آبیاری کی۔(۲۰)

لیکن جوں جوں ساقی ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے ویسے ہی شاہداحمد دہلوی کے اداریوں کے اسلوب میں پختگی آتی جاتی ہے۔ ابتدائی چند سال کے اداریوں میں ان کی یہ کوشش رہی کہ دلّی کے حوالے سے یہ داغِ بدنامی ہٹایا جائے کہ یہاں ادب کے سوتے سوکھ چکے ہیں۔ اس لیے ابتدائی اداریوں میں ان کے زیادہ تر مخاطب اہلِ دلّی ہی ہیں اور دلّی کا ذکر اور دُنیائے ادب میں اس کی اہمیت کا پرچار ہے۔ مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو:

آج باوجود ہماری کم توجہی اور بے اعتنائی کے دہلی کی فصاحت اور بلاغت و عظمتِ زبان کا نام اب بھی زبان زد خلائق ہے اور ایک عالم میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا سکّہ جاری ہے۔ ہمیں آج بھی وہی فخر حاصل ہے جو کہ نصف صدی پیشتر تھا یعنی:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' (۲۱)

ادب اور زبان

ماہنامہ ساقی کی خاصیت یہ رہی ہے کہ ابتدائی سال سے ہی شاہداحمد دہلوی نے ساقی کے خاص نمبروں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو کہ خود ایک بہت بڑا اور مشکل کام تھا۔ ان خاص نمبروں اور ساقی کی اشاعت کا شاہداحمد دہلوی کے نزدیک صرف ایک ہی مقصد تھا ''ادب کی خدمت اور اس کا فروغ'' جس کا اظہار انھوں نے اپنے ہر اداریے میں کیا کہ ''پاکیزہ ادبِ اُردو کا فروغ ہے۔''(۲۲) ادب کی ترقی اور فروغ میں زبان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ جب کوئی قوم اپنی زبان سے غفلت کا رویہ اختیار کرتی ہے تو وہیں سے اُس کی تباہی کا آغاز ہوجاتا ہے جو اس کی قومی موت کا باعث بنتا ہے۔ آج کے دور میں ہم جس طرح انگریزی زبان کے محکوم بنتے جارہے ہیں یہی صورتِ حال بیسویں صدی کے نصف آخر میں تھی۔ زبان کی اہمیت اور اس کی افادیت کے بارے میں اس وقت بھی ہمارے ادیب مختلف رسائل اور جرائد میں اس کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاہداحمد دہلوی جو اُردو زبان (خاص طور پر دہلی کی زبان) کے شیدائی تھے، انھیں اس بات کا شدّت سے احساس تھا کہ ہماری ترقی اور کامیابی کا واحد راستہ ہماری زبان اُردو سے جڑا ہوا ہے۔ مئی ۱۹۳۰ء کے ماہ نامہ ساقی کے اداریے میں لکھتے ہیں:

اگر ہم تنازع بلقا میں اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے فلسفہ، اپنی طب، اپنے فنون، اپنی حکمت کو زندہ کریں۔ اگر ہماری زبان ہماری تعلیم کا جز بن کر زندہ ہوجائے تو وہ خود ہی رفتہ رفتہ مغربی زبان کے اختلاط سے اپنے تمام نقائص سے پاک ہوجائے گی۔(۲۳)

مئی ۱۹۳۰ء کا پورا اداریہ ہی اُردو زبان کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں ہے جو کہ اُردو زبان کے بارے میں مکمل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مغربی

علوم وفنون سے منھ موڑ لیا جائے بلکہ آج کی طرح اس وقت بھی اس امر کی ضرورت تھی کہ مغربی علوم اور جدید علوم کے ساتھ مشرقی علوم سے بھی اتنی ہی واقفیت اور اُنسیت رکھی جائے۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی اس بات کی طرف اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ:

> میں یہ نہیں کہتا کہ ہم مغربی اور جدید علوم کی ضرورت سے آزاد ہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جب تک مشرقی اور مغربی علوم ساتھ ساتھ حاصل نہ کیے جائیں گے تعلیم ہمارا جزو زندگی نہ ہوگی، ہمارا تمام نام نہاد فضل و کمال نقش بر دیوار ہوگا۔ اور ہمارا وجود دُنیا کے لیے محض بیکار رہے گا۔(۲۴)

اُردو زبان سے محبت و اُنسیت کا اظہار ہمیں ان کے اداریوں میں جابجا نظر آتا ہے۔ اُردو زبان کی خدمت کا جو بیڑا انھوں نے اُٹھایا اسے پار لگانے کے لیے انھیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس میں رسالہ ساقی میں شائع ہونے والے مضامین پر تنقید اور ادبی حلقوں کی نکتہ چینیاں بھی شامل ہیں جنھوں نے ادبی معرکوں کی صورت بھی اختیار کی۔(۲۵) اس قسم کی تحریریں پڑھ کر ہمیں شاہد احمد دہلوی کی ادبی بصیرت کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ وہ اُردو ادب سے کس قدر گہری وابستگی رکھتے تھے۔

شاہد احمد دہلوی نے دیگر سیاسی اُمور کو تو زیادہ اپنے اداریوں کی زینت نہیں بنایا لیکن جہاں بھی مسئلہ زبان و ادب کا آیا وہ فوراً قلم لے کر میدان میں اُترے۔ کئی اداریوں میں انھوں نے زبان کے مسئلے پر مفصل لکھا۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے اداریوں میں بطور خاص اس مسئلے کو عوام کے سامنے لاتے ہوئے گاندھی جی کے متعصّبانہ رویّے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہندی کا پرچار کرنے میں اوروں کا تو ذکر ہی کیا، خود گاندھی جی نے جن کو عام سطح سے بلند رہ کر صرف سیاسی معاملات پر اپنے مفید مشورے پیش کرتے رہنا چاہیے اپنے من میں ٹھان لی کہ جس طرح بھی ہو سیدھی سادی آسان زبان میں سنسکرت کے وہ مشکل الفاظ زبردستی ٹھونسے جائیں جنھیں کاشی کے پنڈت بھی ''شبد ساگر'' کے بغیر نہ سمجھ سکیں۔(۲۶)

صرف یہی نہیں جب کبھی ضرورت محسوس کی اُردو زبان کے بارے میں نازک معاملات کو بھی نوکِ قلم پر لائے۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون اُردو زبان کا مسئلہ (۲۷) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے اُردو کی ساخت، آغاز، مقبولیت اور مستقبل کے بارے میں اہم نکات پر بحث کی ہے۔

ساقی کے اداریے اور ادبی تنقید

ساقی کے اداریوں کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں ہمیں نہ صرف اُردو ادب کی مختلف اصناف کے بارے میں شاہد احمد دہلوی کا نقطۂ نظر ملتا ہے بلکہ اس عہد میں خواص و عوام کے رُجحانات کے ساتھ شاہد احمد دہلوی کے رُجحانات کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ وہ تنقید کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے اداریوں میں ادیبوں کی نگارشات پر بڑی جچی تلی آرا ہوتی تھیں۔ ان کے مزاج میں جدّت اور نیا ادبی سلیقہ تھا۔ نگاہِ اوّلیں میں انھوں نے بعض نئے مباحث کا آغاز کیا جن پر ان کے زمانے میں بہت کم توجہ دی گئی۔ ادبی تنقید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> تنقید اگر صحیح معنوں میں میسّر آجائے تو اس سے ڈرنا یا بُرا ماننا اتنی بڑی اخلاقی کمزوری ہے کہ انسان کو مراحلِ زندگی میں کامیاب نہیں ہونے دیتی مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ خوبیاں خوبیوں کی جگہ ہوں اور مبالغہ سے پاک صاف ہوں۔ عیب عیبوں کی جگہ ہوں اور نکتہ چینی اور تنقیص کے جذبات سے منزہ ہوں۔ (۲۸)

یعنی ہمارے بعض ادیب تبصرے میں صرف تنقید اور نکتہ چینی کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ادبی تنقید کا حق ادا کر دیا جب کہ ایسی تنقیدی بصیرت اصلاحی غرض سے کبھی بھی فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔

تنقید کے ذیل میں مزاح کے موضوع کے بارے میں بھی شاہد احمد دہلوی نے نگاہِ اوّلیں (مارچ ۱۹۳۱ء) میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ شمارہ چونکہ ظریف نمبر کے عنوان سے تھا اس لیے اس میں چھپنے والے مضامین کے علاوہ ظرافت کیا ہے؟ کے بارے میں شاہد احمد دہلوی اداریے میں مفصل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ظرافت کا مقصد یہ ہے کہ خود پسندی، ابلہ فریبی، غلط فہمیوں اور ان کے نتائج کی وضاحت کی جائے اس طرح کہ زندگی کا مضحکہ خیز پہلو نمایاں رہے۔ (۲۹)

ماہ نامہ ساقی کے افسانے اور ترقی پسندی

شاہد احمد دہلوی ساقی کے لیے اعلیٰ مضامین اور اچھے افسانوں کی تلاش میں بڑی کد و کاوش کیا کرتے تھے۔ ان کی اس خوبی نے اُردو ادب میں جدید افسانے کو بہت فروغ دیا۔ ساقی کے ذریعے اُردو افسانہ

نگاری کے میدان میں وسعت پیدا ہوئی اور بڑے بڑے نام ادبی دُنیا میں متعارف ہوئے۔ ساقی کا افسانہ نمبر جو ہر سال جولائی میں شائع ہوتا تھا اس نے جدید افسانے کی روایت کو کافی فروغ دیا۔ شاہداحمد دہلوی ابتدائی چند سال کے بعد جب دہلوی متانت سے ہٹ کر جدیدیت کی طرف مائل ہوئے تو ساقی میں ترقی پسند مصنّفین کے افسانے اور مضامین کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ان کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بارے میں پروین الٰہی لکھتی ہیں:

> شاہداحمد کو ترقی پسند تحریک سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جب اس تحریک کی بنیاد قائم ہوئی اور انجمن ترقی پسند مصنّفین دلّی میں قائم ہوئی تو شاہد صاحب ایک زمانے تک اس کے جنرل سیکریٹری تھے اور انھوں نے ساقی کے ذریعے ترقی پسند ادب کا دل کھول کر پرچار کیا۔(۳۰)

یعنی ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ساقی میں شامل مضامین اور افسانوں کا انتخاب ترقی پسندانہ ترجیحات کی بنا پر زیادہ کیا جانے لگا اور ساقی میں ادب کے نئے طرز کو زیادہ سراہا جانے لگا۔ ساقی کی اس روش کو ساقی کے پُرانے قارئین نے بھی محسوس کیا۔ کچھ تو اس انداز سے متاثر ہوئے لیکن کچھ معترض۔ مثلاً ۱۹۳۷ء کے اداریے میں روش کی اس تبدیلی پر ایک قاری کو اعتراض تھا کہ ''ساقی اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔''(۳۱) اس کے جواب میں شاہداحمد دہلوی لکھتے ہیں:

> زندہ اور پائیدار ادب پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ترقی پسند ہوں... پہلے عشقیہ کہانیاں اور غزلیں ہمیں بہت پسند تھیں۔ مگر اب بھوک اور افلاس، فلاحی اور آزادی، سماج اور تہذیب اسی نوع کے ضروری مسائل نے ہماری تمام تر توجہ جذب کرلی ہے۔ پیشِ نظر مسائل کا ہمارے ادب میں آنا ضروری ہے بس اسی قسم کی چند وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ساقی اب وہ نہیں رہا جو ۱۹۳۰ء میں تھا۔(۳۲)

لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے دور میں جب ساقی میں زندگی کے حقائق کے سلسلے میں عریاں نگاری بھی درآئی جس میں منٹو، عصمت کے افسانوں کے علاوہ دیگر لکھنے والوں کی تحریروں مضامین کو بھی اس دور کے اعتبار سے عریانی کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا تو شاہداحمد دہلوی نے مضامین کے انتخاب میں کچھ کچھ احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا اور کوشش کی کہ ساقی کی پُرانی وضع کو برقرار رکھتے ہوئے ''پاکیزہ مضامین''(۳۳) کی

اشاعت پر خصوصی توجہ دیں لیکن اس بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے ترقی پسندانہ مضامین کی اشاعت کو رد کیا، بلکہ تہذیبی دائرے کا ''کچھ'' خیال رکھا۔

مضامین کی اشاعت میں بہتری کے سلسلے میں نومبر ۱۹۴۰ء میں جب ناظرینِ ساقی سے مفید مشورے طلب کیے گئے تو ایک خاتون کے مشورے کو اداریے میں شامل کیا گیا جو کچھ یوں تھا:

> پچھلے دنوں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ساقی منگانا بند کر دوں کیوں کہ اس میں ایسے مضامین شائع ہونے لگے تھے کہ ساقی شریف عورتوں کے پڑھنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ مگر آپ نے اپنی روش بدل دی ہے اس لیے میں نے بھی اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ براہ کرم اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ ساقی کے پڑھنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔(۳۴)

اس سے پتا چلتا ہے کہ قارئین کے احتجاج کا شاہد احمد دہلوی اور ساقی پر کچھ نہ کچھ اثر بہر حال ضرور ہوا۔

جدید افسانے کی روایت اور ساقی

شاہد احمد دہلوی کی افسانے پر خصوصی توجہ نے جدید افسانے کی ترقی میں بڑا اہم کردار اَدا کیا۔ نئی طرز کا کوئی بھی اچھا افسانہ ہوتا تو شاہد احمد دہلوی اسے ضرور سراہتے چاہے وہ ان کے ساقی میں چھپتا، ہمایوں یا ادبی دُنیا میں۔ اس ضمن میں ساقی کے خصوصی شماروں میں افسانہ نمبر کو بہت اہمیت حاصل رہی۔(۳۵) افسانہ نمبروں میں شاہد احمد دہلوی نے جولائی ۱۹۳۴ء میں اپنی طرز کا ایک انوکھا طرحی افسانہ نمبر نکالا جس میں ایک ہی پلاٹ پر بارہ افسانے لکھوائے گئے۔ اس خصوصی نمبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے کی ترقی میں ساقی نے کیا کیا جدّتیں اختیار کیں۔ طرحی افسانے کی عوام میں پسندیدگی کے بعد اگست ۱۹۳۴ء کے نگاہِ اوّلیں میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ساقی کے افسانہ نمبر کی یہ جدّت بہت پسند کی گئی ایک ہی پلاٹ پر بارہ افسانے لکھوائے گئے یہ صورت اس لیے اختیار کی گئی کہ عام روش سے ساقی بچا رہے۔ صحافتِ اُردو کو فروغ دینے کے لیے نئی نئی باتیں پیدا کرنی ضروری ہیں۔(۳۶)

ساقی کی مقبولیت کا اہم سبب بھی یہی تھا کہ وہ کبھی جمود کا شکار نہیں ہوا۔ اس میں شائع ہونے والے افسانے

اور مضامین زندگی کے اُتار چڑھاؤ، رنگینی اور حقیقت کے صحیح ترجمان ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء کے بعد کے اداریوں میں شاہد احمد دہلوی کی تحریر میں پختگی اور روانی کے ساتھ ساتھ زبان کی کاٹ اور طنز بھی شامل ہوجاتا ہے۔ وہ لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے نہ تھے۔ جو بات ناگوار گزرتی اسے فوراً نوکِ قلم پر لے آتے۔ ان کی اس خوبی کے بارے میں سیّد ولایت حسین خمارؔ دہلوی لکھتے ہیں:

> شمس العلما خواجہ حسن نظامی مرحوم کے بعد بے لاگ شخصیت نگاری کسی نے نہیں کی بلکہ خواجہ صاحب بھی مروّت میں نقائص بیان کرتے وقت طرح دے جاتے تھے مگر شاہد خود بھی بے باک تھے ان کی زبان بھی اور قلم بھی۔ وہ ذرا لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔[۳۷]

شاہد احمد دہلوی کی طبیعت میں اُپج تھی۔ انھوں نے ساقی کے لیے اپنے قریبی دوستوں کے تعاون سے نہ صرف نئے نئے منصوبے بنائے اور نئی راہیں تلاش کیں بلکہ تحقیق اور جستجو سے بھی کام لیا۔[۳۸] انھوں نے اپنے اداریے میں ادبی رسالوں اور تازہ مطبوعات پر تنقید و تبصرے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جس میں کسی ادب یا ادیب کے متعلق جو بھی رائے وہ قائم کر لیتے بغیر کسی رُو رعایت کے لکھ ڈالتے تھے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جس میں کسی ادبی رسالے کے خاص نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسکول کی کتابوں میں سے مضامین منتخب کرکے اس میں جمع کردیے گئے ہیں... اس کے مطالعے سے اسکول کی گزری ہوئی بہاروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے دوسرا اس کا حجم اس طرح بڑھایا گیا ہے کہ اس میں اشتہارات جابجا ٹھونسے گئے ہیں یہ اس لحاظ سے ادبی تحفہ ہے کہ... خاص نمبر کے ساتھ ساتھ پاؤ بھر ردّی بھی ملے گی۔[۳۹]

یعنی جو بات پہنچانا چاہتے ہیں وہ براہِ راست بھی ہوتی تھی۔ ان کے اسلوب میں طنز اور تنقید کا اپنا انداز ہے۔

ساقی کی ایک اہم روایت یہ بھی رہی ہے کہ ان تمام ہستیوں کو جو کسی نہ کسی حوالے سے ادب اور ساقی سے وابستہ رہیں، ان کے بچھڑ جانے پر انھیں ایک تعزیتی عبارت یا مضمون کے ذریعے یاد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں لکھے جانے والے زیادہ تر مضامین یا تعزیتی کلمات نگاہِ اوّلیں میں شاہد احمد دہلوی خود تحریر کرتے تھے۔ یہی وہ مضامین اور کلمات تھے جہاں سے شاہد احمد دہلوی ایک عمدہ خاکہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ نگاہِ اوّلیں میں علامہ راشد الخیری، میر بہار ناصر علی اور عظیم بیگ چغتائی پر خاص طور سے

شاہد احمد دہلوی کا قلم چلتا ہے تو ایک شاہکار تخلیق قارئین کے سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ستمبر ۱۹۳۶ء کے نگاہِ اوّلیں میں علامہ راشد الخیری کے بارے میں تحریر کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> جب سے ہوش سنبھالا اپنے خاندان میں ایک بزرگ کو اکثر آتے جاتے دیکھا تل چاؤلی ڈاڑھی، کتابی چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کھلی ہوئی پیشانی، اس پر غم کی شکنیں، بھاری بھرکم بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ ترکی ٹوپی، شیروانی اور نیچی نیچی موریوں کا پائجامہ ہوتا تھا... ان کا اصلی نام عبدالرشید ہے... دُنیا انھیں علامہ راشد الخیری کے نام سے جانتی ہے۔(۴۰)

شخصیت نگاری اور واقعات نگاری کا ایسا نمونہ جب صفحۂ قرطاس پر بکھرتا ہے تو جالبی صاحب جیسا ادب شناس محقق انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے فن کی اس خوبی کو نگاہِ اوّلیں کے صفحات سے بڑھا کر باقاعدہ ادبی حیثیت دیں اور اُردو کے مایہ ناز اہلِ قلم اور ثقہ حضرات کے خاکے تحریر کریں۔ جمیل جالبی کے پُرزور اصرار پر ہی شاہد احمد دہلوی کی مایہ ناز تصنیف گنجینۂ گوہر وجود میں آئی جسے اُردو خاکہ نگاری کے عمدہ نمونوں کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

خاکہ نگاری کے علاوہ ایک بہترین رپورتاژ دسمبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں نگاہِ اوّلیں میں جامعہ ملیہ دہلی کا یوم تاسیس اور مشاعرہ کے نام سے شائع ہوا جو کسی بھی صورت فنی اعتبار سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف دلی کا ایک یادگار مشاعرہ سے کم نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک فرضی مشاعرے کا بیان تھا اور دوسرا حقیقی مشاعرے کا بیان۔ اس رپورتاژ میں شاہد احمد دہلوی نے زبان و بیان کا جو انداز اختیار کیا وہ پڑھنے والے کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کرتا ہے اور حاضرینِ مشاعرہ کی بے بسی کی رُوداد بن جاتا ہے۔ اس رپورتاژ کی ایک مختصر عبارت ملاحظہ ہو:

> ایک صاحب جن کو قدرت نے بہت ہی مختصر پیمانے پر بنایا تھا، اسٹیج پر تشریف لائے، سامعین کی طرف انھوں نے روگردانی فرمائی تو معلوم ہوا کہولت کے ظالم ہاتھوں نے گویا انھیں نچوڑ کر کھڑا کر دیا ہے۔ نہ معلوم ان بزرگ کے اسٹیج پر رُونما ہوتے ہی ہال مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے کیوں بھر گیا۔(۴۱)

واقعے کا بیان، سراپا نگاری، جزئیات نگاری اور شگفتگی، شاہد احمد دہلوی کا مخصوص اسلوب ہے۔ ان کی نثر کی یہ خوبیاں پورے رپورتاژ میں نمایاں ہیں۔

ساقی کے اداریے اور دوسری جنگ عظیم

دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء کے شروع ہونے سے ملکی حالات جس طرح متاثر ہوئے اسی طرح ہر شعبۂ زندگی بھی متاثر ہوا۔ ادب چونکہ زندگی کا ترجمان سمجھا جاتا ہے اس لیے ادبی رسائل اور جرائد کے مضامین میں بھی جنگی موضوعات درآئے۔ جنگی حالات کی وجہ سے پیش آنے والے نقصانات میں ادبی رسائل کی اشاعت میں کمی بھی شامل ہے جس کی بنیادی وجہ کاغذ کی عدم دستیابی اور قیمت میں بے تحاشا اضافہ تھا۔ اس کمی کی وجہ سے نہ صرف بہت سے رسائل کی ضخامت متاثر ہوئی بلکہ ایسی نوبت بھی آئی کہ بہت سے رسائل نکلنا بند ہوگئے۔ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء تک کے ساقی کے اداریوں میں بھی اس کمی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ کاغذ کی کم یابی کے بارے میں نگاہِ اوّلیں میں شاہد احمد دہلوی طنزاً لکھتے ہیں:

> سفید کاغذ دورانِ جنگ میں ایسا غائب ہوا کہ اس کی صورت کو ترس گئے۔ اسے جنگ کے ہتھیاروں میں شامل کرلیا گیا تھا اس لیے عوام کے لیے نایاب ہوگیا۔(۴۲)

کاغذ کی کمی کی بدولت ایک وقت ایسا آیا کہ شاہد احمد دہلوی کو مارچ ۱۹۴۳ء میں ساقی کو وقتی طور پر بند کرنا پڑا۔ یہ بندش نومبر ۱۹۴۳ء تک جاری رہی اور نو مہینے غیر حاضری کے بعد ساقی کی اشاعت دوبارہ جاری ہوسکی۔(۴۳)

جنگ کے دوران کاغذ کی کمی کا جہاں تمام رسائل و جرائد کے مدیران کو شکوہ رہا وہاں شاہد احمد دہلوی اس کمی کو بہترین ادب کی اشاعت کا سبب جانتے ہوئے کہتے ہیں:

> جنگ کی گرانی اور کاغذ کی نایابی سے جہاں لٹریچر کو بے حد نقصان پہنچا وہاں ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ناقص اور گھٹیا ادب کی اشاعت بڑی حد تک معدوم ہوگئی ہے۔ اب صرف وہ ادب شائع ہوسکتا ہے جس کا مطالعہ ناگزیر ہے یا جس کو زندہ رکھنا کسی قیمت پر بھی مہنگا نہیں۔(۴۴)

جنگ کے زمانے میں لکھے جانے والے ادبی مضامین اور مصنّفین دونوں کے مزاج میں فرق آیا۔ بہت سے ادیب اور شاعر حکومتِ ہند کی سرپرستی قبول کرتے ہوئے پروپیگنڈا کے کاموں میں جت گئے۔ ان میں کٹر انقلابی اور اصول پرست دونوں قسم کے افراد شامل تھے۔ اس صورت حال کو مدّنظر رکھتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے نگاہِ اوّلیں میں بحث کرتے ہوئے ادبی سرگرمیوں میں رجحانات کی تبدیلی پر اعتراضات کیے۔ ان کے مطابق:

ادب کے ہتھیاروں سے کھیلنے والے حکومت کے وقار کی خیر منانے لگے۔(۴۵)

یہی نہیں اس قسم کے بے شمار موضوعات کو شاہد احمد دہلوی نے اپنے اداریوں میں جگہ دی اور ہر اس بحث طلب موضوع پر بحث بھی کی۔ ان میں سب سے زیادہ اُردو زبان اور اس سے متعلق پیش آنے والے متنازع رویوں کو خاص طور سے اپنے اداریوں کا حصّہ بنایا اور ہمیشہ اُردو زبان سے اپنی محبت کا اظہار قلم کے ذریعے کیا۔

ساقی کے اداریے قیامِ پاکستان کے بعد

اگست ۱۹۴۷ء تک ساقی کی اشاعت کا سلسلہ دہلی سے جاری رہا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد دہلی سے پاکستان ہجرت کے بعد شاہد احمد دہلوی نامساعد حالات اور ذہنی و قلبی پریشانی کے باعث پورا ایک سال رسالہ ساقی شائع نہ کر سکے۔ ایک سال بعد ساقی کا پہلا شمارہ کراچی پاکستان سے ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے اداریے نگاہِ اوّلیں میں شاہد احمد دہلوی نوزائیدہ مملکت سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ مل گیا۔ پاکستان مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔(۴۶)

پاکستان سے ساقی کی اشاعت میں ایک اہم تبدیلی جو نظر آئی وہ شاہد احمد دہلوی کی ترقی پسند تحریک سے علیٰحدگی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کے بارے میں وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

جب سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک شروع کی تو ان کی خواہش کے مطابق میں نے ہی ترقی پسند مصنّفین کی پہلی انجمن قائم کی تھی اور میں ہی اس کا سیکریٹری تھا...
جب اس کے مقاصد نے غلط رُخ اختیار کیا تو میں نے اس انجمن کو ختم کر دیا۔(۴۷)

لیکن انجمن ترقی پسند مصنّفین سے علیٰحدگی کی ایک اہم وجہ ساقی میں چھپنے والی محمد حسن عسکری کی تحریریں بعنوان جھلکیاں ہیں جن میں عسکری صاحب کھری کھری باتیں لکھتے۔ ان کے بے لاگ تبصرے کی زد میں ترقی پسند مصنّفین بھی آ گئے چنانچہ ان ادیبوں نے ساقی کا بائیکاٹ کیا لیکن اس بائیکاٹ کا ساقی کی مقبولیت پر کوئی خاص اثر نہ ہوا اور ترقی پسند مصنّفین کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تو کراچی کے ایک جلسے میں اس کا اعتراف کیا گیا۔(۴۸)

قیامِ پاکستان کے بعد ساقی کے شماروں میں ایک اور اہم تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ ۱۹۴۷ء سے شاہد احمد دہلوی کی وفات ۱۹۶۷ء تک متعدد ماہ نامے ایسے ہیں جن میں اداریہ نہیں لکھا گیا، یہاں تک کہ اکثر خاص نمبروں سے بھی نگاہِ اوّلیں غائب ہو گیا۔

ماہ نامہ ساقی کے اداریوں میں ہمیں شاہد احمد دہلوی کی ادبی زندگی کے ساتھ اس عہد کے ادبی رُجحانات کا بھی احوال ملتا ہے کیوں کہ ان اداریوں میں شاہد احمد دہلوی صرف اپنے نظریات کا ہی برملا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس عہد کے دیگر ادبی رسائل و جرائد کے رُجحانات، ان کی ادبی کاوشوں پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔

ماہ نامہ ساقی کے اداریوں میں ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک اردو کی ادبی دُنیا کا خاصا احوال، اہم واقعات اور ادبی اُتار چڑھاؤ کا منظر ایسے اسلوب میں درج ہے کہ تحریر کے ساتھ قاری خود کو اسی ماحول کا حصّہ تصوّر کرتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساقی اپنے عہد کا سیاسی، تہذیبی و ادبی نمائندہ ہے۔

حواشی

۱۔ ملّا واحدی، میرے زمانے کی دلی، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۹۔

۲۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینۂ گوہر (کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۲۱۔

۳۔ شاہد احمد دہلوی، آپ بیتی، مشمولہ ساقی (کراچی: ۱۹۷۰ء)، ص ۶۴۶، نیز یہی آپ بیتی شاہد احمد دہلوی کی حیات میں نقوش آپ بیتی نمبر میں بھی شائع ہوئی اور گنجینۂ گوہر میں بھی۔

۴۔ ایضاً، ص ۶۴۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۶۴۸۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۴۷۔

۷۔ راقمہ نے ساقی کے تمام شمارے خود دیکھے ہیں۔ ساقی کا پہلا شمارہ جو غالب لائبریری (کراچی) اور بیدل لائبریری (کراچی) دونوں میں موجود ہے، اس سے بھی استفادہ کیا۔ اس شمارے میں ۲۴ مضامین شامل ہیں اور اہم مصنّفین میں تمکین کاظمی، کیف دہلوی، قاضی عباس حسین، انصار، مرزا محمود بیگ صاحب، قاری سرفراز حسین عزمی، حضرت حیدر دہلوی، قاضی عباس حسین، آغا محمد اشرف خان، جناب مظہر، علامہ مضحک دہلوی کے علاوہ جوش ملیح آبادی، حضرت فراق دہلوی، نذیر احمد کا کلام شامل ہے۔

۸۔ شاہد احمد دہلوی کی زندگی میں یہ ساقی کا آخری شمارہ تھا۔ ان کی وفات (مئی ۱۹۶۷ء) کے بعد ساقی ان کی بیگم عاصمہ شاہد کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء میں شاہد احمد دہلوی نمبر پر اختتام پذیر ہوا۔

۹۔ یہ اداریہ شاہد احمد دہلوی نے شدید علالت کے بعد لکھا تھا اس لیے انتہائی مختصر ہے۔

۱۰۔ شوکت سبزواری، شاہد احمد کا فن، مشمولہ ساقی، شاہد احمد دہلوی نمبر (کراچی: ۱۹۷۰ء)، ص ۱۱۔

۱۱۔ جمیل جالبی، مقدمہ، گنجینۂ گوہر، محولۂ بالا، ص ۱۰۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۱۲۔

۱۴۔ عظمیٰ فرح، کراچی کے ادبی رسائل (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۰ء)، ص ۴۱۔۵۵

۱۵۔ مثلاً خان بہادر میر ناصر علی، حضرت فراق دہلوی، منشی پریم چند، مرزا عظیم بیگ چغتائی، محشر عابدی، سیّد تمکین الکاظمی، حجاب اسماعیل، علامہ راشد الخیری، جوش ملیح آبادی، کیف دہلوی، قیسی رام پوری، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، میر باقر علی، مرزا فرحت اللہ بیگ، امتیاز علی تاج، محمد حسن عسکری، امین حزیں، انتظار حسین، چراغ حسن حسرت، عبدالرحمٰن چغتائی، شوکت

تھانوی، اوپندرناتھ اشک، اعظم کریوی وغیرہ۔

۱۶۔ اس بندش کے بارے میں دسمبر ۱۹۴۳ء کے اداریے میں شاہداحمد دہلوی نے خودلکھا اور عارضی طور پر بند کرنے سے پہلے بھی انھوں نے فروری ۱۹۴۳ء کے اداریے میں اعلان کردیا تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: فروری ۱۹۴۳ء اور دسمبر ۱۹۴۳ء کے شماروں کے اداریے۔

۱۷۔ آزادی سے قبل ہندوستان میں شائع ہونے والا ساقی کا یہ آخری شمارہ تھا جس کا ایک نسخہ ایک غالب لائبریری اور بیدل لائبریری میں محفوظ ہے۔

۱۸۔ پاکستان (کراچی) سے شائع ہونے والا یہ ساقی کا پہلا پرچہ تھا اس شمارے میں اہم مصنّفین محمدحسن عسکری، امین حزیں، انتظارحسین، حجاب امتیازعلی، چراغ حسن حسرت، عشرت رحمانی، عبدالرحمٰن چغتائی، شوکت تھانوی، اثرصہبائی، ایم اسلم کے مضامین و افسانے شامل ہیں۔

۱۹۔ ساقی کا آخری شمارہ شاہداحمددہلوی نمبر تھا جس میں شاہداحمد دہلوی کی شخصیت، فن اور ادبی کاوشوں پر نامور ادبا کے مضامین شامل ہیں جن میں شوکت سبزواری، محمداحسن فاروقی، غلام عباس، ممتازشیریں، امراؤبندوخاں، انصارناصری، رازق الخیری، حجاب امتیازعلی، ن م راشد، ابوالفضل صدیقی، وقارعظیم، احمدندیم قاسمی، ماہرالقادری، قرۃ العین حیدر، انتظارحسین، مختارصدیقی، ابن انشا، تابش دہلوی، سیّدولایت حسین خماردہلوی، ملاواحدی، جمیل جالبی، اسلم فرخی، حکیم محمدسعیددہلوی، محمدحسن عسکری، رئیس امروہوی، حفیظ ہوشیارپوری جیسے بڑے قلم کاروں کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ شمارہ جمیل جالبی کی کاوش سے مرتّب ہوا۔

۲۰۔ ساقی (اداریہ)، (دہلی: جنوری ۱۹۳۰ء)، ص ۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۔

۲۲۔ ایضاً، (دہلی: اپریل ۱۹۳۵ء)، ص ۲۔

۲۳۔ ایضاً، (مئی ۱۹۳۰ء)، ص ۳۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ شاہداحمددہلوی نے اداریوں میں کئی جگہ ''پاکیزہ ادب'' کی اصطلاح مضامین کے اسلوب اور موضوعات کے ضمن میں استعمال کی ہے۔

۲۶۔ ایضاً، (اکتوبر ۱۹۴۶ء)، ص ۲۔

۲۷۔ ساقی، شاہداحمددہلوی نمبر (کراچی: ۱۹۷۰ء)، ص ۲۰۴۔۴۱۰

یہ مضمون نقوش کے مدیر طفیل صاحب کے مارچ ۱۹۶۳ء کے اداریہ میں اُردوزبان کی ترویج کے بارے میں اہلِ زبان کے طرزِعمل کو نشانۂ تنقید بنانے کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں انھوں نے اُردوزبان پر نہایت جامع، رواں اور مدلّل مضمون تحریر کیا جو خط کی صورت میں ہے۔

۲۸۔ ایضاً، (جولائی ۱۹۳۰ء)، ص ۴۔

۲۹۔ ایضاً، (اپریل، ۱۹۳۱ء)، ص ۶۔

۳۰۔ پروین الٰہی، شاہداحمددہلوی (دہلی: کلرپرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء)، ص ۵۶۔

۳۱۔ ساقی (اداریہ)، (دہلی: دسمبر ۱۹۳۷ء)، ص ۲۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ ساقی میں شاہداحمد نے ''پاکیزہ مضامین'' کی اصطلاح کا استعمال اپنے اداریوں میں کیا۔

۳۴۔ ایضاً، (نومبر ۱۹۴۰ء)، ص ۲۔
۳۵۔ ساقی کے آغاز کے سال یعنی ۱۹۳۰ء سے ہی شاہد احمد دہلوی نے جولائی کے شمارے کو افسانہ نمبر کے لیے مختص کر دیا تھا اور یہ سلسلہ آخر تک چلا۔
۳۶۔ ایضاً، (اگست ۱۹۳۴ء)، ص ۲۔
۳۷۔ ولایت حسین خمار دہلوی، سیّد، ہمدم دیرینہ، مشمولہ ساقی، شاہد احمد دہلوی نمبر (کراچی: ۱۹۷۰ء)، ص ۲۷۷۔
۳۸۔ پروین الٰہی، محولۂ بالا، ص ۵۲۔
۳۹۔ ساقی (اداریہ)، (دہلی: نومبر ۱۹۳۱ء)، ص ۲۔
۴۰۔ ایضاً، (دہلی: ستمبر ۱۹۳۶ء)، ص ۲۔
۴۱۔ ایضاً، جامعہ ملیہ کا یوم تاسیس (دہلی: دسمبر ۱۹۳۲ء)، ص ۲۔
۴۲۔ ایضاً، ص ۳۔

مآخذ

۱۔ پرویز، سجاد حیدر، اُردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۵ء۔
۲۔ پروین الٰہی، شاہد احمد دہلوی، دہلی: کلر پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء۔
۳۔ جالبی، جمیل، مقدمہ، گنجینۂ گوہر، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۲ء۔
۴۔ دہلوی، شاہد احمد، گنجینۂ گوہر، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء۔
۵۔ _____، آپ بیتی، مشمولہ ساقی، کراچی، ۱۹۷۰ء۔
۶۔ دہلوی، ولایت حسین خمار، سیّد، ہمدمِ دیرینہ مشمولہ ساقی، شاہد احمد دہلوی نمبر، کراچی، ۱۹۷۰ء۔
۷۔ سبزواری، شوکت شاہد احمد کا فن، مشمولہ ساقی، شاہد احمد دہلوی نمبر، کراچی، ۱۹۷۰ء۔
۸۔ عارف، سیّد محمد، شاہد احمد دہلوی: احوال و آثار، کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، ۲۰۰۰ء۔
۹۔ فرح، عظمیٰ، کراچی کے ادبی رسائل (ایک تجزیاتی جائزہ)، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۰ء۔
۱۰۔ واحدی، ملّا، میرے زمانے کی دلی، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۱۳ء۔

رسائل

۱۔ ماہ نامہ ساقی، دہلی، جنوری ۱۹۳۰ء تا فروری ۱۹۴۳ء (متعدد شمارے)
۲۔ _____، دسمبر ۱۹۴۳ء تا اگست ۱۹۴۷ء۔
۳۔ _____، کراچی، ستمبر ۱۹۴۸ء تا مئی ۱۹۶۷ء۔
۴۔ _____، شاہد احمد دہلوی نمبر، مرتّبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی: ۱۹۷۰ء۔
۵۔ نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور: جون ۱۹۶۴ء۔